پروفیسر میرزا محمد منوّر

پروفیسر میرزا محمد منور سے میں عرصے سے نام آشنا تھا لیکن ان سے ملاقات اورینٹل کالج لاہور کے ایک فنکشن میں ہوئی۔ ۱۹۸۳ء میں مخدومی ڈاکٹر وحید قریشی اورینٹل کالج کے پرنسپل تھے۔ ان کی عنایت سے کالج کے دیگر اساتذہ مثلاً ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر تحسین فراقی اور ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار سے ملاقات اور بعد میں دیرپا تعلقات کی بنیاد پڑی۔ اس وقت کالج کی ایک تقریب جس میں کالج اور پنجاب یونی ورسٹی کے اساتذہ شریک تھے، مجھے بھی مدعو کیا گیا۔ اس محفل میں میرزا منور بھی تھے۔ ان کی من موہنی شخصیت، بزم آرائی اور شگفتگی نے پہلی ملاقات میں متأثر کیا۔ مختصر سی بات چیت کے دوران انکشاف ہوا کہ ہمارے خیالات اور امراض میں خاصی ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔ مثلاً وہ دمہ کے مریض تھے اور مجھے بھی کبھی کبھی سانس کی تکلیف ہوتی تھی۔ تبادلۂ امراض و خیالات کے بعد آپ نے مجھے اپنا ہم دمہ ساتھی قرار دیا۔

کچھ عرصے بعد میرزا صاحب اقبال اکادمی کے ڈائریکٹر ہو گئے۔ اس زمانے میں اکادمی کا دفتر ماڈل ٹاؤن لاہور میں تھا۔ ''ایوانِ اقبال'' میں مستقل ڈیرا ڈالنے سے قبل اکادمی جوگیوں کے مانند ٹھکانے بدلتی رہی۔ میں میرزا صاحب سے ملنے اکادمی کے دفتر گیا تو آپ بہت محبت سے ملے۔ میری تواضع کیک، پیسٹری اور پیٹیز سے کی۔ سچ پوچھیے تو اس

دعوت کے بعد ان کے خیالات سے اختلاف کی جرأت بھی جاتی رہی۔ ان کی عنایت یہیں تک محدود نہ تھی بلکہ آپ ''سفرنامۂ اقبال'' کا دوسرا ترمیم شدہ ایڈیشن بھی چھاپنے پر آمادہ تھے۔ اس وقت یہ کتاب کراچی کے ایک اشاعتی ادارے میں چھپنے کے مراحل سے گزر رہی تھی۔ میرزا صاحب نے فرمایا اس کے چھپنے سے قبل جو اخراجات ہو چکے تھے، اکادمی انھیں ادا کرنے کے لیے تیار تھی۔ ان کی یہ پرخلوص پیش کش اپنی جگہ لیکن اس وقت میرے لیے اس پر عمل ممکن نہ تھا۔ گفتگو کے دوران میرزا صاحب دفتری کام نبٹاتے رہے۔ دفتر کے اوقات تمام ہوئے تو میرزا صاحب بھی ''آنے والی تھاں'' پر آگئے، یعنی بزلہ سنجی اور شگفتہ گفتاری کا سلسلہ شروع ہوا۔ انھوں نے اپنی کتابوں کا سیٹ بطورِ تحفہ دیا اور مزید کرم یہ کیا کہ اپنی کار میں میری قیام گاہ پر چھوڑ دیا۔

میرزا منور صاحب کا قد نکلتا ہوا، جسم بھرا ہوا، فراخ پیشانی، آراستہ بال، ماتھے کے درمیان سے نکلی مانگ اور کھلتا ہوا گندمی رنگ تھا۔ چہرے پر عموماً تبسم رقصاں رہتا لیکن کسی لطیفے یا شگفتہ بات پر کھل کر قہقہہ لگاتے۔ آپ فکر سے زیادہ جذبے کے آدمی تھے۔ ان کی شخصیت اسلام، علم وفن سے گہری وابستگی، خلوص اور وضع داری، اقبال شناسی اور پاکستان سے عشق کا مرکب تھی۔ یہ عناصر ان کی شخصیت کے اجزائے ترکیبی تھے لیکن کیمیا کے کسی فارمولے کے تحت ان اجزا کی ملاوٹ کے دوران قدرت نے ان میں شدت کا عنصر داخل کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میرزا صاحب کی پسند و ناپسند کا معیار بھی پاکستان اور اسلام سے وابستگی ٹھہرا۔

میرزا صاحب آزادی سے قبل ریلوے میں ملازم تھے۔ ملازمت اپنی جگہ لیکن تحریکِ پاکستان سے وابستگی اور اس کے لیے کام کرنا میرزا صاحب کے نزدیک عبادت تھی۔ اس دور میں آپ نے ہندوؤں کی ناانصافیوں اور تعصب کے جو مظاہر دیکھے ان کے اثرات ان کے دل و دماغ پر بہت گہرے مرتسم ہوئے۔ آزادی کے بعد آپ نے اردو، عربی اور فلسفے میں ایم اے کیا۔ آپ اردو، فارسی اور عربی ادب کے مزاج شناس تھے۔ اس کے علاوہ شاعر اور مقرر بھی تھے۔ ان کی نثر میں کہیں کہیں خطابت یا شاعری کے اثرات پائے جاتے۔ ۱۹۸۸ء کے آخر میں انتخابات کے بعد جب پیپلز پارٹی کی حکومت برسرِ اقتدار

آئی تو کچھ عرصے بعد میرزا صاحب نے نظریاتی اختلافات کی بنا پر اقبال اکادمی کی ڈائریکٹرشپ سے استعفیٰ دے دیا۔ اس دورِ بے خیر میں مرکز میں وزیرِ بربادیِ تعلیم سیّد غلام مصطفیٰ شاہ صاحب تھے۔ شاہ صاحب کو اردو زبان اور ہند اسلامی تہذیب سے خاص رغبت تھی۔ تحریروں اور تقریروں میں جب آپ ان موضوعات پر گوہر افشانی فرماتے تو علم، تہذیب، شرافت اور متانت محوِ تماشائے لبِ بام رہ جاتے اور شاہ صاحب تعصب کی ناؤ میں بہتے غلاظت کے دریا میں دور نکل جاتے۔ پیپلز پارٹی کا وہ دور میرزا صاحب کے لیے بہت صبر آزما اور تکلیف دہ تھا۔

۱۹۹۰ء میں موسمِ بہار میں میرا لاہور آنا ہوا تو قیام فالیٹیز ہوٹل میں تھا۔ میرزا صاحب اقبال کادمی سے سبک دوش ہو چکے تھے، اس لیے ملنے کے مواقع پہلے کی نسبت زیادہ تھے۔ اقبال ہمارا مشترک محبوب تھا۔ اس مناسبت سے میرزا صاحب نے مجھے اپنا پیر بھائی قرار دیا۔ کچھ عرصہ قبل آپ نے ہفت روزہ ''زندگی'' میں ایک مضمون پاکستان کے سیاسی نشیب و فراز کے متعلق لکھا۔ میرزا صاحب کو اہلِ اللہ حضرات سے بہت عقیدت تھی اور جس بزرگ میں مستقبل بینی کی صلاحیت پاتے ان سے پاکستان کے مستقبل کے بارے میں سوال کرتے۔ مندرجہ بالا مضمون میں میرزا صاحب نے پاکستان کے مستقبل کے بارے میں دو بزرگوں سے استفسار کیا تھا۔ لاہور کے ایک بزرگ نے بذریعۂ کشف جنرل ضیاء الحق کی شہادت اور ان کے بعد لولی لنگڑی جمہوریت کے قیام اور کچھ عرصے بعد بساطِ جمہوریت کے لپٹنے اور ڈنڈے والے مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کی حکومت کی پیشین گوئی کی تھی۔ انھوں نے بھارت سے جنگ اور کشمیر کی آزادی کی بشارت بھی دی تھی۔

اس مضمون میں میرزا صاحب نے راول پنڈی کے غلام مصطفیٰ چغتائی صاحب کا تعارف کرایا۔ چغتائی صاحب نے مختلف ادوار میں ذوالفقار علی بھٹو کے زوال، سکھوں اور ہندوؤں کے درمیان خونی رشتہ قائم ہونے یعنی ان دونوں قوموں کے درمیان جنگ اور نہ ختم ہونے والی منافرت اور بالآخر آزاد سکھ ریاست کے قیام کی پیشین گوئی کی تھی۔ انھوں نے کشمیر کی آزادی کے لیے مسلح جدوجہد اور آزاد کشمیری ریاست کے قیام کی نوید دی تھی۔

اس مضمون کے مطالعے کے بعد میرزا صاحب کے لیے میری عقیدت میں بہت اضافہ ہوا۔ انھوں نے میری آرزوؤں کو مستقبل کی خاکہ گری میں سمو دیا تھا۔ مزید کرم یہ کیا کہ آپ نے غلام مصطفیٰ چغتائی صاحب، جو ان دنوں لاہور آئے ہوئے تھے، سے ملوا دیا۔ ان سے ملنے کے بعد میرے رہوارِ تخیل کو مہمیز لگی اور اکثر خواب میں خود کو کشمیر کے مرغزاروں میں یا دلی کی گلیوں میں پاتا اور سامنے مجاہدینِ پاکستان مارچ کر رہے ہوتے اور خوب صورت لڑکیاں نیم برہنہ لباس میں رقص کر رہی ہوتیں۔ اس عالم میں تو فلمی اداکارائیں بھی اپسرا لگتی تھیں۔ اسباب و علل کا تعلق جوڑنے کی زحمت تو کبھی میں نے جاگتے میں گوارا نہ کی، یہ تو پھر خواب تھے۔

لاہور میں موسمِ بہار واقعی پر بہار ہوتا ہے۔ انھی ایام میں ایک دفعہ حادثاتی طور پر فجر کے وقت آنکھ کھل گئی۔ طبیعت کی لہر اور موسم کی موزونیت نے سیر پر مجبور کیا۔ قریب ہی باغ جناح تھا، وہاں کی راہ لی۔ پرندے تو فجر کے وقت جاگنے اور نغمہ سرائی کے لیے قدرت کی جانب سے مامور تھے لیکن انسانوں کو اس وقت جاگتے اور سیر کرتے دیکھ کر حیرت ہوئی۔ نہ جانے ان پر کیا بجوگ پڑا جو یہ خوابِ خرگوش کے مزے لینے کے بجائے گھر سے نکلنے پر مجبور ہوئے۔ باغ جناح کا ایک گوشہ ورزش کرنے والوں کے لیے مخصوص تھا۔ یہاں اتفاقی طور پر میرزا منور سے ملاقات ہوئی۔ معلوم ہوا کہ آپ بیماری کا مقابلہ سیر اور ورزش سے کرتے تھے اور ڈاکٹروں کے مستقل گاہک بننے سے منکر تھے۔ ڈاکٹروں، گورکنوں اور دوا ساز اداروں کے تعاونِ باہمی کے بھی مخالف تھے۔ یہاں ایک ڈاکٹر نظر آئے جو بہت عجلت میں تھے۔ ان کے متعلق میرزا صاحب نے فرمایا کہ ان میں اور عزرائیل کے درمیان مریضوں کے لیے مسابقت بہت شدید تھی۔

حالات خواہ کتنے ہی حوصلہ شکن اور روح فرسا ہوتے لیکن میرزا صاحب ملک اور قوم کے بارے میں ہمیشہ پرامید رہتے اور اپنی باتوں سے مخاطب کے دل میں بھی آشاؤں کا دیا جلا دیتے۔ نوجوانی کے دور میں آپ نے عام کارکن کی حیثیت سے تحریکِ پاکستان میں حصہ لیا تھا۔ پاکستان سے محبت کو بمنزلۂ ایمان تصور کرتے۔ آپ ہندوؤں کے تعصب سے

بخوبی واقف تھے اور اس کا گہرا مشاہدہ اور مطالعہ کیا تھا۔ نتائج فکر کو آپ نے ''مشاہدۂ حق کی گفتگو'' اور ''دیوارِ برہمن'' نامی کتابوں میں سمو دیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ جس طرح دیوارِ برلن کی تباہی سے مشرقی جرمنی اور مشرقی یورپ اشتراکیت کے چنگل سے آزاد ہوئے اسی طرح شمالی ہند کے برہمنوں کے اقتدار کا خاتمہ بھارتی مسلمانوں اور ہند کی دیگر اقوام کی آزادی اور نجات کا موجب ہوگا۔

جلد ہی دورِ بے ضمیر تمام ہوا۔ اقتدار کی وہ ہنڈیا جو کمیشنوں اور بدعنوانیوں کی آنچ پر پک رہی تھی، اچانک اگست ۱۹۹۰ء میں الٹ گئی۔ اقتدار کی تبدیلی کو میرزا صاحب نے اپنی ذاتی فتح خیال کیا۔ انھیں یہ خوش گمانی تھی کہ اس اکھاڑ پچھاڑ کے بعد پاکستان کے استحکام اور خوش حالی میں اضافہ ہوگا، عوام کو سماجی انصاف میسر آئے گا اور غریبوں کی قسمت سنور جائے گی لیکن ہمارا نظام اس قدر فرسودہ و ناکارہ ہو چکا تھا کہ چہروں کے بدلنے سے ملک و قوم کی تقدیر بدلنا ممکن نہ تھی۔

ہمارے وطن میں اہلِ علم کی وہ قدر نہ ہوئی جس کے وہ مستحق تھے۔ بھارت میں اگر ڈاکٹر ذاکر حسین اور رادھا کرشنن منصبِ صدارت پر فائز ہو سکتے ہیں تو یہاں پروفیسر میرزا منور جیسے افراد صدر کے عہدے کے لیے نامزد کیوں نہیں کیے جاتے؟ میرزا صاحب بڑے درجے کے عالم نہ سہی لیکن پاکستان خواہی اور اسلام سے وابستگی میں تو بے مثل تھے۔ ان جیسے افراد کا صدر منتخب کیا جانا ملک کی نیک نامی، وقار اور عزت میں اضافے کا موجب بنتا۔

میرزا صاحب کے آخری ایام خاصے تکلیف دہ تھے۔ دسمبر ۱۹۹۷ء میں، میں جب ان سے ملا تو انھیں مختلف عوارض لاحق تھے۔ نقل و حرکت محدود تھی اور بیشتر وقت بستر پر گزرتا تھا۔ ایک کمرے میں کتابوں کی الماریوں، سادگی اور گرد و غبار کا بسیرا تھا تو دوسرے کمرے میں کتابوں کے ڈھیر کے درمیان میرزا صاحب کا بستر، میز اور کرسیاں چنی ہوئی تھیں۔ باتوں سے اندازہ ہوا کہ دوستوں سے ملاقات آپ کے لیے دوائی کا اور مطالعہ ٹانک کا کام دیتا تھا۔ ان جیسے باغ و بہار آدمی کو اس عالم میں دیکھ کر افسوس ہوا لیکن ان کی شگفتگی، رجائیت، حافظے اور ذہن کی براقی میں کوئی کمی نہ تھی۔ آپ کے عقائد میں

صوفیانہ رواداری تو نہ تھی لیکن امراض کی شدت کے باوجود ان میں صوفیوں کا صبر و استغنا تھا۔ ذاتی مصائب کا سرسری انداز میں تذکرہ کرنے کے بعد ہماری گفتگو پاکستانی تاریخ اور سیاسیات کے گرد گھومتی رہی۔ اس زمانے میں فاروق لغاری صدارت سے مستعفی ہو چکے تھے اور ان کی جگہ رفیق تارڑ صدر منتخب ہوئے۔ میرزا صاحب کو متوسط طبقے کے ایک متدین شخص کے انتخاب پر خوشی ہوئی۔ وہ اسے ملک کے لیے نیک فال سمجھتے تھے۔ وہ طبقۂ اشرافیہ اور زمین داروں کے استحصال، سازشوں اور بدعنوانیوں سے بہت وحشت زدہ تھے۔

میرزا صاحب کے مشہور شاعر حفیظ جالندھری سے گہرے مراسم رہے تھے۔ ان کی شخصیت تضادات کا مجموعہ تھی۔ میرزا صاحب نے حفیظ صاحب کی غیرتِ دینی اور راجپوتی تہور کا عجیب واقعہ سنایا۔ آپ نے فرمایا کہ آزادی سے قبل ماڈل ٹاؤن لاہور میں ہندو کثرت سے آباد تھے۔ یہ مال دار اور بارسوخ لوگ تھے۔ اس علاقے میں مسلمان بہت کم اور مسجدیں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ مسلمان راج مزدور ہندوؤں کے ڈر سے چھپ کر نماز ادا کرتے۔ حفیظ صاحب کو پتا چلا تو انھوں نے مزدوروں کے ساتھ مل کر ماڈل ٹاؤن کے مرکزی چوک میں نہ صرف نماز باجماعت ادا کی بلکہ ان مزدوروں کے ساتھ مسجد کی بنیاد رکھی۔ بعد میں مسلمانوں نے مسجد کو نہ صرف پختہ کیا بلکہ اسے وسعت بھی دی۔ باتوں کے دوران دوپہر کے کھانے کا وقت آیا تو میرزا صاحب نے بااصرار مجھے کھانے میں شریک کیا۔

میرزا صاحب نے بتایا کہ آپ آزادی سے قبل نارتھ ویسٹرن ریلوے میں ملازم تھے۔ ۱۹۴۵ء کے انتخابات ہو چکے تھے جس میں آل انڈیا مسلم لیگ کو عدیم المثال کامیابی نصیب ہوئی۔ یہ الیکشن مسلم لیگ کی نمائندہ حیثیت متعین کرنے اور قیامِ پاکستان کے لیے اتمامِ حجت ثابت ہوئے۔ پنجاب میں مسلم لیگ کے شدید مخالفوں میں یونینسٹ پارٹی، مجلسِ احرار، کانگرس اور ہندو مہا سبھا پیش پیش تھے۔

اسی زمانے میں مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری ریل میں سفر کر رہے تھے۔ گرمیوں کے دن تھے، مولانا کے عقیدت مند اور رفقائے سیاست مولانا کے آرام کی خاطر مسلسل

پنکھا جھل رہے تھے۔ میرزا منور بھی اسی کمپارٹمنٹ میں تھے۔ آپ نے دستی پنکھا اپنے ہاتھ میں لیا اور اپنے زورِ بازو سے مولانا کو ہوا دینے لگے۔

مولانا نے جب اس نوجوان کو عقیدت میں اس قدر سرشار پایا تو اپنے پاس بلایا اور گفتگو کا آغاز کیا۔ میرزا صاحب نے ذاتی تعارف کے بعد فرمایا کہ انھوں نے اسلام اور مسلم امت سے وابستگی کا جذبہ مولانا بخاری کی تقریروں اور مولانا ظفر علی خاں کی نظم و نثر سے حاصل کیا۔ انھی حضرات کی کاوشوں سے ان کے دل و دماغ میں مسلم قومیت کا تصور راسخ ہوا۔ جدوجہدِ آزادی کے اس کٹھن مرحلے پر جب منزل قریب اور پاکستان کا قیام ممکن نظر آ رہا تھا، مجلسِ احرار کا مسلم لیگ اور پاکستان کی شدید مخالفت کرنا اور متحدہ قومیت کا بے سرا راگ الاپنا، کفار کا ساتھ دینے اور مسلمانوں سے غداری کے مترادف تھا۔ آخر ان جیسے متدین اور سمجھ دار انسان نے یہ صورتِ حال کیسے گوارا کی؟

مولانا بخاری میرزا صاحب کی باتیں غور سے سنتے رہے اور ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ کچھ دیر بعد مولانا نے سرگودھا کے مخصوص پنجابی لہجے میں میرزا صاحب سے فرمایا کہ ''لڑکے ایک طرف تو تم کسی اور کو پنکھا بھی جھلنے نہیں دیتے اور دوسری طرف تم یہ مباحث چھیڑ کر مجھے زچ کیے دے رہے ہو۔ گود میں بیٹھ کر داڑھی نوچنا اسے ہی کہتے ہیں۔ جاؤ! میرا پیچھا چھوڑو۔'' میرزا صاحب نے بتایا کہ اس گفتگو سے ان کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ انھوں نے پنکھا مولانا کے ساتھی کے ہاتھ میں دیا اور دوسرے کمپارٹمنٹ کی راہ لی۔

میرزا صاحب نے جس جوش اور جذبے کے ساتھ دورِ جوانی میں تحریکِ پاکستان میں حصہ لیا، زندگی کے آخری لمحے تک تحریر اور تقریر کے ذریعے پاکستان سے عشق کو نبھایا۔ اب ایسے وفا پیشہ افراد دیکھنے کو آنکھیں ترستی ہیں۔ ان کے اس دنیا سے جانے سے وطن کی ویرانی میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔

(بدھ، ۲۰ ستمبر ۲۰۰۰ء)